اقوال زریں

جالینوس

- عزت اور بزرگی کا ہر شخص طالب ہے، مگر اسے حاصل کرنے کی رغبت کم ہی لوگ رکھتے ہیں۔
- عقل مندوہ شخص ہے کہ اپنی زبان کو دوسروں کی مذمت سے بچائے رکھے۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا
ROZNAMA RASHTRIYA SAHARA KANPUR

ایک جج کا اصلی چہرہ

2014

بلکہ پورا معاشرہ قلب پرست ہوگیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سماجی ہم آہنگی اور بھائی چارہ کا مکمل خاتمہ ہوگیا ہو۔ معروف سماجی اقدار کو قدامت پسندی کہا جانے لگا ہے، اخلاقی اقدار میں بھی انقلابی تبدیلی آ گئی ہے۔ انسان کی شناخت اس کے مزاج اور کردار کے بجائے اس کے کپڑوں سے کی جانے لگی ہے۔ جمہوری رسم ورواج اور سیکولر تانا بانا بھی بکھر رہا ہے۔ آئینی عہدوں پر فروکش اصحاب بدست وکشاد کھلے عام آئین کو اپنے پاؤں تلے روند رہے ہیں۔ سکرانوں کی بات تو الگ رہی ہے، رقم کھرانی اور نشہ اقتدار میں مست و بدحال انہیں تو آئین کا کوئی پاس ہی نہیں رہا ہے۔ وہ اس خودفریبی کے شکار ہیں کہ ان کا اقتدار فانی نہیں طوالتی ہے جو ان کی زندگی کی آخری سانس تک جاری رہے گا، اس لیے وہ نوشتہ دیوار دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کرتے۔ مگر حیرت تو اب یہ آن پڑی ہے کہ آئین کی بالادستی کی علامت سمجھنے والے جماعت بھی خم ٹھوک کر اس حمام میں اتر آئے ہیں۔ آئین کی حرمت کا پاس نہ وقار کا لحاظ ہی ان کے پاؤں کی زنجیر بن پاتا ہے اور نہ اخلاقی اقدار ہی ان کے حصلوں کو لگام لگا پاتی ہے۔ آئین کی سربلندی کا حلف اٹھانے والے گرامی قدر منصفان عظام آئین سے متعلم نظریاتی دانشگاہ کا اظہار ہی نہیں بلکہ برملا اعلان بھی کرنے لگے ہیں۔ اسی طرح کا ایک اعلان چند یوم پہلے اپنے اعزاز میں دیے جانے والے ایک استقبالیہ میں کلکتہ ہائی کورٹ کے جج جسٹس چترنجن داس نے کیا۔ منصف والاشان نے فرمایا کہ آج انہیں اپنی اصلی شکل دکھانی ہے۔ وہ ایک تنظیم کے بہت معتکور ہیں۔ وہ نوجوانی سے جوانی تک وہاں رہے ہیں۔ اپنی جوانی کے دوران انہوں نے بہار اور ایلماندر ماسیکھا ہے۔ دوسروں کے ساتھ مساوی رویہ رکھنا سیکھا ہے اور سب سے بڑھ کر حب الوطنی کا جذبہ اور کام کرنے کے عزم کو سیکھا ہے، چاہے آپ کہیں بھی کام کریں۔ کچھ لوگوں کو یہ پسند نہیں آئے گا۔ اس کے باوجود انہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ آر ایس ایس (راشٹریہ سویم سیوک سنگھ) کا رکن تھے اور ہیں۔ سنگھ کے اعجاز نظر کا ہی کرشمہ ہے کہ ان کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل ہوئی، ان کے اندر ہمت، حوصلہ، حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہوا۔

یہ تقریب ان کی سبکدوشی کے موقع پر کولکاتا میں گزشتہ 20 مئی پیر کے روز بپا کی گئی تھی جس میں مختلف محکموں اور وزارتوں کے حکام اور نظام عدل وانصاف سے وابستہ معزز ہستیاں موجود تھیں۔ اپنے فرمودات عالیہ سے سبھی کو بہرہ مند کرتے ہوئے انہوں نے انصاف کے اصولوں کی بھی عقدہ کشائی کی۔ موصوف نے فرمایا کہ وہ دو اصولوں پر انصاف کرنے کی کوشش کرتے ہیں، پہلا ہمدردی، دوسرا یہ کہ انصاف کرنے کیلئے قانون کو توڑا جا سکتا ہے، لیکن قانون کے مطابق انصاف کو نہیں توڑا جا سکتا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کوئی غلط کام نہیں کیا، اسی لیے انہیں یہ کہنے کی ہمت ملی کہ وہ ایک تنظیم سے وابستہ ہیں، کیونکہ اگر وہ اچھے انسان ہیں تو کسی بری تنظیم میں شامل نہیں ہوسکتے۔

آئین وجمہور کے پاسداروں کیلئے ان کا یہ پرمغز خطاب وجہ اضطراب بنا، سوالات اٹھے، جس کے بعد موصوف نے کل بدھ کے روز وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ انہیں اپنے بیان پر کوئی شرمندگی نہیں ہے۔ وہ الوداعی خطاب تھا جس میں وہ سبھی کا شکریہ ادا کر رہے تھے، سنگھ ان کی جڑ ہے، اس کے تئیں اظہار تشکر میں انہیں کوئی عار نہیں۔ اس کے ساتھ انہوں نے اس بات سے انکار کیا ہے کہ بحیثیت جج اپنے 14 برسوں کی مدت کار میں انہوں نے کسی سے کوئی تعصب برتا ہے بلکہ انہوں نے ہر فرد وبشر کو مساوی حیثیت دی ہے۔

ایک فرد، ایک شہری کی حیثیت سے چترنجن داس کی نظریاتی اور سیاسی وابستگی کسی سے بھی ہوسکتی ہے۔ آئین آئین اس کی اجازت دیتا ہے کہ وہ آزادی افکار واظہار پر عمل عمل پیرا رہیں۔ لیکن آئین کی سربلندی کا حلف اٹھانے والے جج صاحب کی نظریاتی وابستگی آئین سے متصادم کسی اور دیا تنظیم سے ہو اور وہ اس کا فخریہ اعلان کرتے ہوئے اظہار تشکر بھی کریں تو پھر یہ قابل غور ہوجاتا ہے۔ جج صاحب نے اپنے الوداعی خطاب میں انصاف کے وزیریں اصول بیان کرتے ہوئے اس پر غرور وخوش کی خودستی دعوت بھی دے دی ہے۔

اب قاعدے کی رو سے ہونا تو یہ چاہیے کہ بحیثیت ان کے دیے گئے فیصلوں کو پرکھا جائے کہ کتنے مقدمات انہوں نے ہمدردی کی بنیاد پر فیصلے کیے ہیں اور کتنے مقدمات میں 'انصاف' دینے کیلئے انہوں نے 'قانون شکنی' کی ہے۔ تقاضائے وفا نبھاتے ہوئے کہیں سنگھ سے تو انہوں نے ہمدردی نہیں کی ہے یا پھر سنگھ یا اس سے وابستگان کو 'انصاف دینے کیلئے کہیں قانون توڑنا ہے۔ کیوں کہ حالیہ برسوں میں کلکتہ ہائی کورٹ کے کئی ایک فیصلے تنازعات کا شکار رہے ہیں اور کہا جارہا ہے کہ وہ سیاسی دباؤ میں دیے گئے ہیں۔ یہ بھی زیرغور رہے کہ اسی کلکتہ ہائی کورٹ کے ایک عالی مرتبت جج باقاعدہ انتخابی دے کر آج بھارتیہ جنتا پارٹی کے ٹکٹ پر انتخابی میدان میں دادِ سیاست پار ہے ہیں۔

edit2sahara@gmail.com

ہندوستان کا 18 واں پارلیمانی انتخاب اور مسلمان

عبدالماجد نظامی

2024

کے عام انتخاب کے بیشتر مراحل پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے ہیں اور 4 جون تک یہ واضح بھی ہوجائے گا کہ اس کا نتیجہ کس سیاسی خیمہ کے حق میں جائے گا۔ البتہ نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو لیکن جمہوریت کو بچائے رکھنے کی فکر میں ملک کے شہریوں نے جس طریقہ سے حصہ لیا ہے، اس سے اتنا اندازہ تو ضرور ہو جاتا ہے کہ ان میں اس نظام کے تحفظ کا جذبہ باقی ہے۔ حالانکہ اس انتخابی عمل میں حصہ لینے والوں کی شرح میں نسبتاً کمی آئی ہے لیکن اس کے اسباب ہوسکتے ہیں جن کے ذکر کرنے کا یہ موقع نہیں ہے، لیکن اتنا کہنا تو حق بجانب ہوگا کہ جمہوری نظام حکومت میں عوام کی رائے کی اہمیت سب سے زیادہ ہوتی ہے کیونکہ حکومت کی تشکیل میں عوام کی شرکت کلیدی کردار نبھاتی ہے۔ عوام کی اس حق رائے دہی کا احترام کامیاب جمہوریتوں میں عموماً کیا جاتا ہے اور پالیسی سازی کے وقت عوامی نمائندگان اس بات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں کہ انتخاب کے لیے جو منشور شائع کیا گیا تھا، اس پر عمل درآمد کیا جائے تاکہ اگلے انتخاب میں جب وہ عوام سے دوبارہ روبرو ہوں تو ان کے سامنے رپورٹ کارڈ پیش کرسکیں اور موجودہ ترقی وفلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہنے کا یقین دلا سکیں۔ ہندوستانی جمہوریت کے سامنے مسائل گرچہ رہے ہیں لیکن اس کو کامیاب جمہوریتوں کی فہرست میں اس لیے شمار کیا جاتا رہا ہے کیونکہ عوام کی رائے کے احترام میں یہاں کھوٹیں بدلتی رہی ہیں۔ جمہوری ادارے بھی نسبتاً آزادی کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں۔ لیکن گزشتہ ایک دہائی کے اندر جو بدلاؤ ملک عزیز کی سیاست میں آیا اور تشدد وپسند ہندوتو کے ابھار نے پورے ملک کے مزاج اور رویہ میں جو ناقابل یقین تبدیلیاں پیدا ہوئیں ان کے پیش نظر وثوق کے ساتھ یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ ہندوستان کی جمہوریت کو آج بھی عالمی سطح پر وقار کا وہی درجہ حاصل ہے جو 2014 سے قبل کے برسوں میں حاصل تھا۔ یہ بات کسی ذاتی عناد یا ہندوتو کے نظریہ سے عدم اتفاق کی بنیاد پر نہیں کہی جارہی ہے بلکہ اس پشت پر موجود قومی اور بین الاقوامی سطح کے تھنک ٹینکوں کے تجزیوں اور اس موضوع پر گہری نظر رکھنے والے سیاسی ماہرین کی ان تحریروں سے صاف واضح ہے جو وقتاً فوقتاً ملک اور بیرون ملک کے ذرائع ابلاغ میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان تمام تجزیوں اور مطالعوں میں ایک بات پر خاص طور سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ ملک کی مسلم اقلیت کے دستوری حقوق کی حفاظت کرنے میں موجودہ سرکار بہ صرف ناکام ہی رہی ہے بلکہ مسلم اقلیت کی مذہبی آزادی پر خاص طور سے پابندیاں عائد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مسلمانوں کے طرز معاش وماسا سے لے کر ان کے بود وباش اور عقیدہ وفکر کا کوئی پہلو ایسا نہیں بچا ہے جو ہندوتو کی سیاست کے زیر اثر شدید طور پر متاثر نہ ہوا ہو۔ لیکن اس سے زیادہ سنگین پہلو یہ سامنے آیا کہ مسلمانوں کو عوامی اور سیاسی زندگی سے الگ تھلگ کر دینے کی مہم چلائی گئی اور بڑی حد تک ہندوتو کی سیاست اس میں کامیاب بھی رہی۔ 2014 کے انتخاب کے بعد بنی وزارت عظمیٰ کے پہلے دور میں تو خود بعض مسلم مفکرین و دانشوران فرقہ پرستوں کے مسلم مخالف پروپیگنڈوں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے کیونکر کو یہ مشورہ دینا شروع کر دیا کہ وہ اپنے حق رائے دہی تک سے دستبردار ہوجائیں تاکہ وہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے حملوں کی زد میں نہ آئیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا مشورہ تھا جس میں خوف کے گہری نفسیات اور مسلم عوام میں موجود طول نفسی سے عدم واقفیت کا پتہ چلتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے دھمکی آمیز پروپیگنڈوں اور غیر دستوری بلکہ غیر اخلاقی مسلم مخالف بیانیہ کا اثر ملک کی اپوزیشن پارٹیوں پر نہیں پڑا۔ 2014 کے عام انتخاب میں ناکامی کے اسباب کا پہ لگانے کے لیے کانگریس پارٹی نے جب اے کے انٹونی کی قیادت میں ایک کمیٹی تشکیل دی تھی تو بہت واضح الفاظ میں اس کمیٹی نے پارٹی کی ناکامی کے اسباب کو مسلمانوں کے سرمنڈھنے کی کوشش کی تھی اور یہ کہا تھا کہ کانگریس پارٹی کو مسلمانوں کی پارٹی باور کرانے میں بی جے پی کامیاب ہوگئی تھی اور اسی لیے پارٹی کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔ حالانکہ سیاسی بصیرین اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اس وقت کی کانگریس میں داخلی انتشار اور پالیسی پیرالیسس کو اس کی شکست میں زیادہ دخل تھا۔ کانگریس پارٹی اس معاملہ میں اکلوتی پارٹی نہیں ہے جس نے اپنی شکست کے لیے مسلمانوں کو مورد الزام ٹھہرایا ہو۔ بہوجن سماج پارٹی کی مایاوتی بھی ماضی میں اس قسم کی رائے کا اظہار کرچکی ہیں۔ اس کی مزید مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ دراصل تشدد پسند ہندوتو اور فرقہ پرستی سیاست کے مقابلہ میں اپوزیشن پارٹیوں کا اس طرح کمزور پڑنا اور شہریوں کے اسی طبقہ کو مورد الزام ٹھہرانے کی غلطی کر بیٹھنا جو برسراقتدار پارٹی کے نشانہ پر ہو، ایک کامیاب جمہوریت کی علامت نہیں مانا جائے گا۔ ان پارٹیوں کو چاہیے تھا کہ وہ ملک کی اقلیتوں بالخصوص مسلم اقلیت کے جائز دستوری حقوق کے تحفظ کو یقینی بناتیں اور جس محاذ پر بیجا ڈھنگ سے انہیں نشانہ بنایا جارہا ہے، وہاں ان کا دفاع کرتیں۔ لیکن اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ اپوزیشن پارٹیوں نے بھی پوری خود اعتمادی کے ساتھ اپنا یہ کردار نہیں نبھایا۔ اس کے باوجود بھی ملک کی مسلم اقلیت نے نہایت اعلیٰ ظرفی، ہوشمندی اور سیاسی پختگی کا ثبوت دیا اور فرقہ پرست طاقتوں کے اشتعال انگیز بیانات پاان کے ذریعہ کیے گئے حملوں سے بلیٹھ میں آ کر کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جس سے فرقہ پرستوں کے مقاصد پورے ہوتے۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے پورے ملک میں قانل سنائش صبر وضبط کا مظاہرہ کیا اور اپنے مسائل کے حل کے لیے دستوری روشنی میں کوششیں شروع کردیں۔ یہ فرقہ پرستی پر مبنی سیاست کا تقطۂ اہل تک پہنچ جانے کا ہی نتیجہ تھا کہ اس کمیونٹی کی خواتین نے زبردست سیاسی بصیرت اور پرامن سیاسی احتجاج کی ایسی مثال قائم کردی کہ شاہین باغ تحریک کا نام مزاحمت کی علامت کے طور پر دنیا بھر میں جانا گیا۔ ان تلخ تجربات نے مسلم کمیونٹی میں خوف و ہراس پیدا کرنے کے بجائے اس کے اندر اپنے سیاسی، اقتصادی، سماجی تہذیبی اور ثقافتی حقوق کے دفاع کی خاطر دستوری لڑائی لڑنے کا شعور پیدا کردیا۔ اس کا اثر 2024 کے عام انتخاب میں بھی عام طور سے نظر آیا۔ مسلمانوں نے بڑی ہوشمندی سے اپنے اندرونی اختلافات کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے اور پچھلی بڑی تمام مسلم تنظیموں نے اپنی اپنی طرح کمیونٹی کی رہنمائی کا قابل عمل لائحہ تیار کیا ہے اور بہت حد تک ان کے نفاذ کی کوشش بھی کی ہے۔ مسلم سیاسی پارٹیوں نے بھی اس بار مسلم ووٹوں کو منتشر ہونے سے بچانے کی قابل تعریف کوشش کی ہے اور گزشتہ برسوں والی سیاسی افراتفری ان کے درمیان مفقود رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی تمام تر الزامات کے باوجود اس ملک کے سیکولر کردار کو برقرار رکھنے میں مسلمانوں نے ہمیشہ کی طرح اپنا کام بحسن وخوبی انجام دیا ہے اور کسی بھی طرح کے منفی ردعمل سے خود کو بچائے رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرقہ پرست سیاسی پارٹی اور اس کے اعلیٰ لیڈران میں ایک درجہ کی جھنجھلاہٹ بلکہ بدحواسی پائی جاتی ہے اور وہ پھنجھٹ پارے میں کرفرقہ واریت کی بنا پر کس طرح سے ووٹوں کی تقسیم کا کھیل کھیلا جائے۔ اگرچہ 18 مئی کو ''دی انڈین ایکسپریس'' میں شائع اول مئی ورما کے تجزیاتی مضمون سے واضح ہوتا ہے کہ کس طرح سے اکثار مسلمانوں کی سیاسی نمائندگی کو گھٹانے میں تمام سیاسی پارٹیاں یکساں طور پر شریک ہیں اور مسلمانوں کو سیاسی اچھوت بنانے کی عملی کوششیں کی جا رہی ہیں لیکن اس کے باوجود اس ملک کی مسلم اقلیت نے مایوسی کا دامن نہیں تھاما ہے اور پختہ سیاسی شعور کا ثبوت دیتے ہوئے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ ان سیاسی پارٹیوں کا ہاتھ مضبوط کیا جائے جو دستور ہند اور اس کی روح کی حفاظت کا کام کرنے کا عزم رکھتی ہیں۔ یہاں پر مسلم سیاسی پارٹیوں کو یہ بات پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ وہ خود کو ایک مضبوط سیاسی قوت بنانے کی سنجیدہ کوشش ضرور کریں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ زمین پر اتر کر اپنے تنظیمی ڈھانچہ کو مضبوط بنائیں، اپنے سیاسی موقف کو واضح کریں اور مستقبل کے لائحہ عمل کو قابل فائدہ بنانے کے لیے مطلوب وسائل کو حکمت عملی کے ساتھ استعمال کرنے کا خاکہ پیش کریں تاکہ ان کو ایک سنجیدہ سیاسی قوت کے طور پر دیکھا جاسکے اور ملک کے عوام میں ان کو مقبولیت حاصل ہو۔ اس محاذ پر مسلم سیاسی پارٹیاں بہت کمزور نظر آتی ہیں اور اسی لیے ان کو سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا ہے۔ ان کا کوئی واضح منشور بھی نہیں ہوتا جس سے پتہ چلے کہ وہ کیا مواقف پیش کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس مواقع موجود ہیں۔ اگر وہ سماج کے کمزور طبقوں اور مختلف اقلیتوں کے مسائل کو مسلم مسائل کے ساتھ کامیابی کے ساتھ ضم کرسکیں اور ان کے حقوق کے تحفظ کا ایک موثر خاکہ پیش کریں اور پھر انہیں ایک نئی سیاسی قوت میں تبدیل کرلیں تو اس کا پورا امکان ہے کہ وہ ایک بہترین متبادل کے طور پر ابھر سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے بہت محنت، وقت، مطالعہ اور تجزیہ کے ساتھ ساتھ انتہا کے سے کام کرنے والے کیڈر کی ضرورت ہوگی۔ جب تک ان مسئلوں کا حل تلاش نہیں کیا جاتا کہ اب تک مسلم سیاسی پارٹیاں برائے نام ہی انتخاب کے پورے عمل میں شامل رہیں گی۔ جہاں تک فرقہ پرست سیاسی پارٹیوں کا تعلق ہے تو ان کے لیے اس بار کا انتخاب اتنا آسان نہیں ہوگا اور یہی ملک کے حق میں بہتر ہوگا کیونکہ پورے ملک کو جس طرح سے تعصّن کی کیفیت میں مبتلا کر دیا گیا ہے، اس سے اس بات کا خطرہ واقعات ہوگیا ہے کہ کہیں یہاں کی جمہوریت کا رقم ملکٹ نہ ہوجائے جو انہا ذوبنا کی سب سے بڑی جمہوریت کے لیے قتلعامئیدیں ہوگا۔

(مضمون نگار روزنامہ راشٹریہ سہارا کے گروپ ایڈیٹر ہیں)

editor.nizami@gmail.com

روبرو

تپتے جزیروں بنتے شہروں میں جینا محال

پنکج چترویدی

دہلی

سے دہرہ دون کا فضائی فاصلہ بمشکل 200 کلومیٹر ہے اور وہاں کا درجۂ حرارت مسلسل 41 ڈگری سلیسس سے تجاوز کررہا ہے۔ پھر دہلی کو تو 45 سے آگے جانا ہی ہے۔ جب ملک اور دنیا گرمی میں تپتے تھے تو سکون کی تلاش میں لوگ ہماچل پردیش میں آتے تھے۔ اس سال برف سے ڈھکی اس ریاست کے 19 اضلاع میں درجہ حرارت 42 ڈگری سے متجاوز ہے اور حکومت نے وہاں کالا نشانہ دے دیا ہے۔ 20 مئی، اتوار کو اونا کا زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت 44.2 ڈگری سلیسس ریکارڈ کیا گیا۔ اس کے علاوہ ہمیر پور کے نیری کا درجہ حرارت 44.1 ڈگری سلیسس تھا۔ ریاست کے میدانی علاقوں میں گزشتہ چار دنوں سے درجۂ حرارت 40 ڈگری سلیسس سے اوپر ریکارڈ کیا جارہا ہے۔ غور سے دیکھیں تو یہ تپتے ہوئے شہر وہ ہیں جہاں تیزی سے شہرکاری ہوئی۔ جب ہاتھل کا یہ حال ہے تو پھر پنجاب، ہریانہ کا درجۂ حرارت 45 سے متجاوز ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ تو جدید یں تو معلوم ہوگا کہ جن مقامات پر غیر فطری طور پر درجۂ حرارت میں اضافہ ہوا، وہاں کنکریٹ کے جنگلات لگانے میں معاشرہ سب سے آگے رہا ہے۔ جان لیں کہ بڑھتی ہوئی آبادی والے شہروں میں درجۂ حرارت میں اضافہ نہ صرف جسمانی صحت کے لیے مضر ہے بلکہ اپنے ساتھ کئی اور مسائل بھی لے کر آتا ہے۔ دہلی سے بلحتہ غازی آباد کے سرکاری اسپتال میں گزشتہ پندرہ دنوں سے چوتر پے پن اور پھر آنے والے مریض بڑی تعداد میں آرہے ہیں اور یہی نہیں سڑکوں پر لڑائی جھگڑے بھی بڑھ رہے ہیں۔ کام کرنے میں مشکلات کے باعث ایک طرف آمدنی کم ہورہی ہے تو دوسری طرف بجلی اور پانی کے استعمال میں اضافہ نے سمرفہ آمدنی بلکہ بچت بھی متاثر ہورہی ہے۔

ہندوستان کے ایک درجے سے دس صدیوں سے تُری پڑی رہی ہے لیکن ایک تو اب اس کا دائرہ بڑھ رہا ہے، دوسرا اس کے دن بھی دوگنے ہو رہے ہیں۔ شدید گرمی نے ملک میں گزشتہ 50 سال میں 17,000 سے زیادہ لوگوں کی جان لی ہے۔ 1971 سے 2019 کے درمیان لو لگنے کے 706 واقعات ہوچکے ہیں۔ لیکن گزشتہ پانچ برسوں میں شدید درجۂ حرارت اور لو لگنے کے واقعات نہ صرف وقت سے پہلے ہو رہے ہیں بلکہ ان کی شدت زیادہ دیرتک رہتی ہے، خاص طور پر شہرکاری نے اس موسمی آگ میں ایندھن کا کام کیا ہے، شہر اب تپتے دن میں تپتے ہیں، رات اس سے بھی زیادہ گرم ہوا دیتی ہوتی ہے۔ جان لیں کہ یہ اتنا آبادی والے میٹرو پولیس شہروں میں بڑھتا ہوا درجۂ حرارت واحد۔ عجرانِ نہیں، اس کے ساتھ بجلی اور پانی کی ڈیمانڈ میں اضافہ اور آلودہ ماحول بھی نیا عزان کھڑا کرتا ہے۔

امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی کے اجلی سائنس دانوں کے ایک مطالعے کے مطابق بڑھتی آبادی اور گرمی کی وجہ سے ملک کے چار بڑے شہرنئی دہلی، کولکاتا، چینئی اور چینئی سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ پوری دنیا میں بنگلہ دیش کا دارالحکومت ڈھاکہ اس معاملے میں پہلے نمبر پر ہے۔ کولکاتا میں بڑھتے ہوئے خطرے کے پیچھے 52 فیصد گرمی اور 48 فیصد آبادی دمدار ہے۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ اگر باہری بھیڑ کو روکا نہیں گیا تو درجۂ حرارت تیزی سے بڑھے گا اور یہ صحت کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ شہروں میں بڑھتے ہوئے درجۂ حرارت کی متعدد وجوہات ہیں، سب سے بڑی وجہ تو شہری توسیع میں ہریالی کا کم ہونا ہے۔ اگرچہ دیگر جیسے شہر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی ہریالی کے رقبے میں اضافہ ہوا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس شہر میں لگائے گئے زیادہ تر درخت روایتی اونچے درختوں کی بجائے تیزی سے بڑھنے والی جھاڑیاں ہیں، جو زمین کے بڑھتے درجۂ حرارت کی تپاکاریوں سے نمٹنے کے قابل نہیں ہیں۔ ''شہری گرمی کے جزیرے'' شہروں کی متعدد خصوصیات کی وجہ سے بنتے ہیں۔ بڑے درختوں کی وجہ سے بخارات کے بننے اور ان کے اخراج کا عمل جاری رہتا ہے جو زمین کے بڑھتے درجۂ حرارت کو کنٹرول کرتا ہے۔ بخارات کا مطلب ہے مٹی، آبی وسائل وغیرہ سے ہوا میں پانی کا بہاؤ۔ بخارات کا اخراج یعنی پودوں کی جڑوں کے راستے مسام ہوتا ہے۔ جان لیں کہ یہ اتنا آبادی والے میٹرو پولیس شہروں میں بڑھتا ہوا درجۂ حرارت واحد۔ عجرانِ نہیں، اس کے ساتھ بجلی اور پانی کی ڈیمانڈ میں اضافہ اور آلودہ ماحول بھی نیا عزان کھڑا کرتا ہے۔

تجزیہ

سڑکوں کے درمیان ڈیوائیڈرس پر لگائے گئے بوگن ویلیا کی طرح کے پودے زمین کو ڈھنڈا کرنے کے قدرتی عمل میں کوئی کردار ادا نہیں کرتے۔ میٹرو پولیس شہروں کی فلک بوس عمارتیں بھی اسے گرم کررہی ہیں۔ یہ عمارتیں سورج کی تپش سے گرمی کو منعکس اور جذب کرتی ہیں۔ مزید برآں، ایک دوسرے کے قریب بہت سی اونچی عمارتیں بھی ہوا کے بہاؤ میں رکاوٹ بنتی ہیں، ٹھنڈک کو روکتی ہیں۔ شہروں کی سڑکیں اس کے درجۂ حرارت میں اضافہ کرنے کی ایک بڑی وجہ ہیں۔ شہر میں سیمنٹ اور کنکریٹ کے بڑھتے ہوئے جنگلات، ڈامر کی سڑکیں اور بلند وبالا مکان بڑی مقدار میں سورج کی شعاعوں کو جذب کررہے ہیں جس کی وجہ سے شہر میں گرمی بڑھ رہی ہے۔

سائنس دانوں کے مطابق درجۂ حرارت بڑھتا رہے گا، اتنا ہی کئی بیماریاں بڑھیں گی اور لوگ مریں گے۔ سڑکیں چاہے ڈامر کی ہوں یا کنکریٹ کی، گرمی کو جذب کرتی ہیں اور پھر ماحول کا درجۂ حرارت کم ہوتے ہی اسے خارج کردیتی ہیں۔ شہر کو خوبصورت اور دلکش بنانے والے تکنیک میں گرمی جذب کرنے کی صلاحیت بہت زیادہ ہوتی ہے اور یہ گرمی کے ذخیرے کے طور پر کام کرتا ہے۔ مزید برآں، شہروں کے اوپر ماحولیاتی حالات کی وجہ سے اکثر شہری ہوا زمین کی سطح کے قریب پھنس جاتی ہے جہاں اسے گرم شہری عناصر سے گرم کیا جاتا ہے، تاہم شہروں کو بھیگی بنانے میں انسان بھی پیچھے نہیں ہیں۔ گاڑیوں کے چلنے اور عمارتوں میں لگے بلب، کمپیوٹر، فریج اور ایئر کنڈیشنر جیسے بجلی کے آلات بھلے ہی انسان کو سکون دیتے ہوں لیکن یہ شہری ماحول کی وجہ درجۂ حرارت کو بڑھانے میں بڑا کردار ادا کرتے ہیں۔ پھر کارخانے، تعمیراتی کام اور کہلانے والے پتیوں کے مہین سوراخوں کے ذریعے ہوا میں پانی کا آنا جانا ہے۔ سڑکوں کے درمیان ڈیوائیڈرس پر لگائے گئے بوگن ویلیا کی طرح کے پودے زمین کو ٹھنڈا کرنے کے قدرتی عمل میں کوئی کردار ادا نہیں کرتے۔ میٹرو پولیس شہروں کی فلک بوس عمارتیں بھی اسے گرم کررہی ہیں۔ یہ عمارتیں سورج کی تپش سے گرمی کو منعکس اور جذب کرتی ہیں۔ مزید برآں، ایک دوسرے کے قریب بہت سی اونچی عمارتیں بھی ہوا کے بہاؤ میں رکاوٹ بنتی ہیں، ٹھنڈک کو روکتی ہیں۔ شہروں کی سڑکیں اس کے درجۂ حرارت میں اضافہ کرنے کی ایک بڑی وجہ ہیں۔ شہر میں سیمنٹ اور کنکریٹ کے بڑھتے ہوئے جنگلات، ڈامر کی سڑکیں اور بلند وبالا مکان بڑی مقدار میں سورج کی شعاعوں کو جذب کررہے ہیں جس کی وجہ سے شہر میں گرمی بڑھ رہی ہے۔

سائنس دانوں کے مطابق درجۂ حرارت بڑھتا رہے گا، اتنا ہی کئی بیماریاں بڑھیں گی اور لوگ مریں گے۔ سڑکیں چاہے ڈامر کی ہوں یا کنکریٹ کی، گرمی کو جذب کرتی ہیں اور پھر ماحول کا درجۂ حرارت کم ہوتے ہی اسے خارج کردیتی ہیں۔ شہر کو خوبصورت اور دلکش بنانے والے تکنیک میں گرمی جذب کرنے کی صلاحیت بہت زیادہ ہوتی ہے اور یہ گرمی کے ذخیرے کے طور پر کام کرتا ہے۔ مزید برآں، شہروں کے اوپر ماحولیاتی حالات کی وجہ سے اکثر شہری ہوا زمین کی سطح کے قریب پھنس جاتی ہے جہاں اسے گرم شہری عناصر سے گرم کیا جاتا ہے، تاہم شہروں کو بھیگی بنانے میں انسان بھی پیچھے نہیں ہیں۔ گاڑیوں کے چلنے اور عمارتوں میں لگے بلب، کمپیوٹر، فریج اور ایئر کنڈیشنر جیسے بجلی کے آلات بھلے ہی انسان کو سکون دیتے ہوں لیکن یہ شہری ماحول کی وجہ درجۂ حرارت کو بڑھانے میں بڑا کردار ادا کرتے ہیں۔ پھر کارخانے، تعمیراتی کام اور

گرمی اپنے ساتھ بہت سی بیماریاں لے کر آرہی ہے، گرمی کی وجہ سے شہر کے نالوں میں پانی کا درجۂ حرارت بڑھ جاتا ہے اور یہ پانی جب ندی میں ملتا ہے تو اس کا درجۂ حرارت بھی بڑھ جاتا ہے جس کی وجہ سے ندی کی حیاتیاتی زندگی، جس میں نباتات اور حیوانات دونوں ہیں، کے لیے خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جان لیں کہ کسی بھی ندی کو آلودگی سے پاک بنانے میں اس میں موجود حیاتیاتی عناصر کا اہم کردار رہتا ہے۔

شہروں کی گنجان آبادی وبائی امراض کے پھیلاؤ کا آسان ذریعہ ہوتی ہے، یہاں کا آلودہ پانی یا ہوا اندر ہی اندر انسانوں کو کھاتی رہتی ہے اور بیماروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ملک کے تمام بڑے شہران دنوں گرمی کے قہر کو جھیلنے کے مسئلے سے نبرد آزما ہیں۔ پگھرا جمع کرنا اور پھر اسے ٹھکانے لگانا ایک بڑا چیلنج بنتا جارہا ہے۔ یہ تمام چیلنجز بڑھتے ہوئے درجۂ حرارت میں مزید مشکل ہوجاتے ہیں۔

اگر شہر میں گرمی کی مار سے بچنا ہے تو زیادہ سے زیادہ روایتی درخت لگانے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ شہر کے درمیان سے بہنے والی ندیاں، تالاب، جوہڑ وغیرہ اگر صاف ستھرے اور رواں رہیں گے تو بڑھتی ہوئی گرمی کو جذب کرنے میں یہ کام آئیں گے، دفاتر کے وقت میں تبدیلی، پیک فرائیوٹ کا فروغ، کثیر المنزلہ عمارتوں کا ماحول دوست ہونا، توانائی کی بچت سمیت کچھ ایسے اقدامات ہیں جو بہت کم خرچ میں شہر کو بھیگی بننے سے بچا سکتے ہیں۔ ہاں، آخری حل تو شہروں کی طرف نقل مکانی کو روکنا ہی ہوگا۔

pc7001010@gmail.com

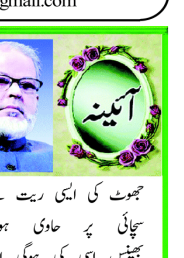

آئینہ

جھوٹ کی ایسی ریت چلے گی
سچائی پر حاوی ہو گی
بھینس اسی کی ہوگی اب تو
جس کے ہاتھ میں لاٹھی ہوگی

اقبال فردوسی

شدت کی گرمی

مکرمی!

گرمی اپنے شباب پر ہے۔ وہ لوگ جو کسی ضرورت یا دفاتر کے لیے گھر سے باہر نکلتے ہیں، اتنی شدید بلکہ جھلسا دینے والی گرمی میں ہلکان ہو جاتے ہیں، ان کا سوچئے جنہیں اتنی شدید گرمی میں بھری دوپہری میں رکشاؤں اور ٹھیلوں کو کھینچنا پڑتا ہے یا جو سامان کی ڈھلائی کرتے ہیں۔ پسینہ سے شرابور، چہرے پر ہوائیاں ان کی تکلیف کو بیان کرتی ہیں لیکن دو وقت کی روٹی کے حصول کے لیے انہیں یہ سب کرنا پڑ رہا ہے۔ ہم ان کی کچھ مدد کرسکتے ہیں جیسے رکشہ کا کرایہ بڑھا کر دے دیا، مزدوری کے عوض کچھ رقم زیادہ دے دی اور اگر ایسا کرنے سے قاصر ہیں تو کچھ نہ سہی